Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 6, Issue 4
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com
Research Article

عبدالرؤف
اسکالر پی ایچ۔ڈی اردو ایم۔وائی یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر محمد وسیم انجم
پروفیسر ، شعبہ اردو ایم وائی یونیورسٹی، اسلام آباد

یونانی فلسفے کے اولین مباحث

Abdul Rauf
Scholar Ph.D. Urdu My University, Islamabad
Dr. Muhammad Waseem Anjum
Professor, Department of Urdu, My University, Islamabad

Received: Oct15, 2025
Accepted: Nov18, 2025
Published: Dec30. 2025

The Foundational Concepts Of Philosophy

The civilizations with which we first come into contact through archaeology are the ancient Greek civilizations whose philosophers seem to have been immersed in physical and metaphysical contemplation. But this does not mean that this is the earliest history of philosophy. This history necessarily marks the evolution of an intellectual continuum, the initial impressions of which have been lost to the ravages of time and are no longer available to us. The impressions that man has been able to access have become the source of European civilization. For two thousand years, European philosophers could not free themselves from the spell of Greek thought. Every subsequent philosopher has accepted the influences of the Greek sages, especially Plato and Aristotle, and most have been delighted with their wisdom. The people of Islam, who, rising above the distinctions of color, race, time and place, consider knowledge and wisdom to be a lost heritage, have also made valuable efforts to understand Greek philosophy. Muslim sages translated the books of Greek sages, wrote commentaries and presented them in their own intellectual mold, which created a fascination with these thoughts and ideas among Muslims as well. These are the reasons that double the need and importance of Greek philosophy in world literature. Ancient Greek society was a pantheistic religion. Like the phenomena of nature, the number of gods was also innumerable. They believed that although the different gods possessed different powers, they were connected by the unity of the same divine family

Keyword: Phenomena**,** Civilizations, Intellectual Continuum, Philosopher, Greek Society, Phenomena

آثار علمی کے وساطت سے جن تہذیبوں کے ساتھ ہمارا اولین رابطہ استوار ہوتا ہے۔ قدیم یونانی تہذیب ان میں سے ایک ہے جس کے فلسفی طبیعیاتی اور مابعدالطبیعیاتی غور وفکر

میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ فلسفہ کی اولین تاریخ ہے۔ لازماً یہ تاریخ ایک فکری تسلسل کے ارتقاء کی نشان دہی کرتی ہے جس کے ابتدائی نقوش دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو کر ہماری دسترس میں نہیں رہے۔ جن نقوش تک انسان کی رسائی ہو سکی ہے وہ یورپی تہذیب کا سرچشمہ قرار پائے ہیں۔ دو ہزار برس تک یورپ کے فلاسفہ یونانی فکر کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکے۔ ہر بعد میں آنے والے فلسفی نے حکمائے یونان خصوصاً افلاطون اور ارسطو کے اثرات کو قبول کیا ہے اور اکثر نے ان کی حکمت سے خوشہ چینی کی ہے۔ اہل اسلام جو رنگ و نسل اور زمان و مکان کے امتیاز سے بالاتر ہو کر علم و حکمت کو گم گشتہ میراث سمجھتے ہیں، انہوں نے بھی یونانی فلسفہ کو سمجھنے کی قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ مسلمان حکماء نے یونانی حکماء کی کتابوں کے تراجم کیے، تشریحات لکھیں اور انہیں اپنے فکری قالب میں ڈھال کر پیش کیا، جس سے مسلمانوں میں بھی ان افکار و نظریات سے دل چسپی کا رجحان پیدا ہوا۔ یہی وہ اسباب ہیں جو ادب عالم میں یونانی فلسفہ کی ضرورت و اہمیت کو دو چند کر دیتے ہیں۔

قدیم یونانی معاشرہ دیومالائی مذہب کا پیروکار تھا۔ مظاہر فطرت کی طرح دیوتاؤں کی تعداد بھی بے شمار تھی۔ ان کے خیال میں مختلف دیوتا مختلف قدرتوں کے حامل ہونے کے باوجود ایک ہی خدائی خاندان کی وحدت سے منسلک تھے۔ اس خدائی خاندان کی اقامت گاہیں آسمان پر فرض کی گئی تھیں۔

''زیوس (Zeus) اس خاندان کا سربراہِ اعلیٰ یارب الارباب تھا۔ یہ بجلی کا دیوتا تھا۔ دھرتی دیوی ''ہیرا'' اس کی بیوی اور شادی کی دیوی تھی۔ سورج اور روشنی کا دیوتا'' اپالو'' جب کہ سمندر اور زلزلہ کا دیوتا ''پوسائیدون'' تھا۔ ''ایتھنا'' زیوس کی بیٹی عورتوں اور ذہانت کی دیوی تھی۔''(۱)

''ایڈوالف ہولم کے مطابق یونانی مذہب میں ان مظاہر فطرت کو معبود بنالیا گیا تھا جن کے حسن، مفاد یا خوف سے انسان متاثر یا مرعوب ہوتا ہے۔''(۲)

''ہومر (آٹھویں صدی قبل مسیح) کی ایلیڈ (Illiad) اور اوڈیسی (Odyssey) میں ہمیں اس دیوتا پرستی کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے۔''(۳)

'' الفرڈ ویبر کے خیال میں یونانیوں کا دیوتاؤں کے بارے میں عقیدہ یہ تھا کہ دیوتا انسان سے زیادہ طاقت ور ہستیاں ہیں لیکن مطلقاً غیر فانی نہیں۔ وہ انسانوں کی بہ نسبت طویل العمر ہوتے ہیں۔ دیوتاؤں کے زیادہ قوی اور دانا ہونے کی وجہ سے ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ ہستیاں کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہوں ایک ایسی چیز بھی ہے جو ان سے زیادہ طاقت ور ہے یعنی تقدیر یا وہ اعلیٰ غیر شخصی اور غیر جانب دار قانون جو ارض و سماوات پر حاکم ہے۔''(۴)

''اس دیومالائی ضعف اعتقاد کے دور میں فلاسفۂ یونان نے ایک ایسے شاندار نظام فکر کی بنیاد ڈالی جو آنے والے وقتوں کی ایک کلامی روایت بن گیا۔ مصر کی حکمت و دانائی کو یونان پر فضلِ تقدم حاصل ہے۔ بہت سے شعبہ ہائے علم مثلاً ریاضیات، ہیئت اور علم طب میں یونانی افکار پر مشرق اور خصوصاً مصر کی تہذیب کے بہت بڑے اثرات کا ثبوت ملتا ہے۔ تاہم فلسفہ کی باقاعدہ اور حکیمانہ ترقی اہل یونان کی خصوصیات میں سے ہے۔ یونانی فلسفہ کے آغاز سے قبل ہی اہلِ بابل اور اہلِ مصر علم کا ایک گراں قدر ذخیرہ جمع کر چکے تھے۔ جس میں فلسفیانہ خیالات و نظریات موجود تھے۔ اہلِ یونان نے انہی معلومات کو اپنے استعمال میں لا کر ارتقاء کا سفر آگے بڑھایا۔'' (۵)

''مصر اور عراق میں تہذیب کی ابتدائی نشو و نما نیل، دجلہ اور فرات کے دریاؤں کے باعث ہوئی۔ مصری اور بابلی تہذیب نمایاں طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مصری موت کے خیال میں محو رہتے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق مردوں کی ارواح زیر زمین چلی جاتی تھیں جہاں اوسیریز (Osiris) کے سامنے ان کے دنیوی اعمال کا حساب ہوتا تھا۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ روح دوبارہ بدن میں لوٹ آتی ہے۔'' (۶)

فلسفہ یونان کو رپیوپارٹ کے خیال میں تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں ایک تدریجی ارتقائے عقلی پایا جاتا ہے:

۱۔ کونیاتی (Cosmological)

۲۔ انسانیاتی (Anthropological)

۳۔ تنظیمی (Systematic)

''فطریت کا دور کونیاتی، سقراط اور سوفسطائیہ کا دور انسانیاتی جب کے افلاطون کا دور عظیمی کہلا سکتا ہے۔'' (۷)

فلسفہ یونان کا آغاز ''فطریت'' یا ''مادیت'' کے نظریے سے ہوا، جس کے تحت یونانیوں نے اس عالم فطرت کو غور و فکر کا محور و مرکز بنایا۔ ان فلاسفہ نے مبداء عالم یا مادۂ کائنات کی ماہیت کی دریافت کے بارے میں اساسی تصورات قائم کیے۔ اس لحاظ سے یونان کے ابتدائی فلاسفہ کو طبیعیاتی یا سائنسی کہا جا سکتا ہے۔ گویا یہ کونیاتی دور تھا۔

اس فطریت اور مادیت کا بنیادی سبب دیومالائی توہمات اور نظریات تھے۔ قدیم انسان کے لیے خارجی کائنات ناقابل فہم تھی۔ وہ زلزلوں، برق و باراں کے طوفانوں اور آسمانی و زمینی آفتوں سے خوف زدہ ہو کر خود کو بے بس محسوس کرتا اور اس کائنات کی حقیقت و ماہیت پر غور کرنے کی سعی کرتا۔ اس خوف و دہشت نے دیومالا کو جنم دیا، جس کے تحت ناگہانی بلاؤں کو انسان نے دیوتاؤں کے غیظ و غضب کا اظہار سمجھا اور عالمِ فطرت میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرات کے فہم کی کوشش کی۔

آرنی مت کے ذریعے اس مادیت میں روحانیت کی کرن پھوٹی۔ آرنی مت کی بنیاد جسم اور روح کی محویت پر تھی۔

''آرفیئسی بدن کو روح کا گھر نہیں بلکہ زنداں سمجھتے تھے۔ ترکِ خواہشات اور نفس کشی کی تعلیم دیتے تھے۔ آخرت کی زندگی کو حقیقی زندگی گردانتے تھے اور بقائے دوام کے لیے پر ہیزگاری اور مجاہدۂ نفس کی تلقین کرتے تھے۔ آرفی مذہب بقائے روح کا قائل تھا اور تناسخِ ارواح پر زور دیتا تھا۔ زیلر کے خیال میں آرنی مت ہندوستان کے نظریہ تناسخ ہی کی ایک شکل تھا۔''(۸)

''جس فلسفی کے ذریعے فلسفۂ یونان میں صوفیانہ رجحانات داخل ہوئے وہ آرفی مت کا ایک مصلح فیثا غورث (۵۸۰-۵۰۰ق م) تھا۔ اس نے اطاعت، مراقبہ، سادہ غذا اور سادہ لباس کی ضرورت پر زور دیا۔ ہیگل کے بہ قول وہ ایک شان دار شخصیت اور کچھ معجزانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ تناسخِ ارواح پر یقین کامل رکھتے ہوئے اس نے اپنے بارے میں بھی کہا کہ وہ کسی سابقہ جنم میں جنگ ٹروجن کا جنگ جو یوفوربس تھا اور اسے اجازت ملی کہ وہ اپنے سابقہ جنموں کا حافظہ اس زمینی زندگی میں ساتھ لائے۔''(۹)

'' قفطی نے لکھا ہے کہ جب سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے اصحاب شام سے مصر میں آئے تو فیثا غورث نے ان سے حکمت سیکھی۔ اس سے پہلے وہ اہل مصر سے علم ہندسہ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ اس نے عددی نسبتوں سے نغموں میں توازن قائم کیا اور دعویٰ کیا کہ اس نے یہ نورِ علم چراغ نبوت سے حاصل کیا ہے۔ وہ اس عالم مادی سے آگے ایک لطیف، روحانی اور نورانی دنیا کا وجود تسلیم کرتا تھا۔ جہاں صرف ان لوگوں کی رسائی ہو سکتی ہے جو غرور، حسد، ریاکاری اور دیگر برائیوں سے پاک ہوں۔''(۱۰)

فیثا غورث کے ہاں خالص سائنسی اور منطقی فکر صوفیانہ تخانات کے ساتھ آمیز ہے۔ راہبانہ طرز زندگی اختیار کرنے کے باوجود فیثا غورث اور اس کے پیروکاروں نے فلسفہ اور ریاضی کو فروغ دیا۔ Mathematics کی اصطلاح بھی اس نے ایجاد کی۔

'' فیثا غورثیوں کے نزدیک اشیا سے کائنات کا اصل سر چشمہ یا جوہر عدد تھا۔''(۱۱)

'' فیثا غورث کے مطابق فکر حس سے افضل ہے اور معقولات محسوسات سے زیادہ حقیقی ہیں۔'' (۱۲)

''لفظ ''فیلسوف '' یا فلسفی (محبِّ دانش) فیثا غورث ہی کا وضع کردہ ہے۔ اس کے خیال میں مسلسل فلسفیانہ غور و فکر سے جو شخص جنم چکر سے نجات حاصل کر لیتا ہے وہی فلسفی ہے۔ فیثا غورث نے کہا کہ اعداد حقیقی، ازلی، ابدی اور زمان و مکان سے ماورا ہیں۔'' (۱۳)

'' بہ تدریج یونان کے فلسفیانہ تفکر نے اپنا زاویۂ نگاہ بدلا اور باطن کی طرف توجہ دیتے ہوئے افعالِ انسانیہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اب موضوعِ فکر انسان کے باطنی حیات، تعقل وارادہ اور اعمال ذہنیہ وغیرہ کو قرار دیا گیا۔ اس دور میں نفسیات، منطق اور اخلاقیات کا آغاز ہوا۔ اس دور کے نمائندہ مکاتب فکر سقراطی اور سوفسطائی ہیں۔ اگرچہ سقراط (۴۶۹-۳۹۹ ق م) نے سوفسطائیوں کی طرح انسان کو موضوع بحث بنایا تاہم وہ سوفسطائیوں کا مخالف تھا اور جلبِ زر کی وجہ سے انہیں حقارت سے دیکھتا تھا۔'' (۱۴)

سقراط نے عرفانِ خویش کی تعلیم دی ہے۔ اپالو کے مندر میں تحریر تین آفاقی سچائیوں میں سے ایک سقراط کا یہ مشہور مقولہ بھی ہے:

"Know thyself" (۱۵)

''اپنی خودی پہچان''

الفرڈ ویبر کے خیال میں :

''سقراط کا کمال یہ ہے کہ اس نے کم از کم اخلاقیات میں جزئی کو کلی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ انسانوں کی بے انتہا بوقلمونی میں اس نے غیر متغیر انسان کو دیکھ لیا۔ ایک تباہ حالِ اخلاق صدی کے مخلوط انبارِ آراء میں سے اس نے ایک غیر متبدل اور بچی رائے کو تلاش کر لیا جو نوع انسان کے ضمیر یا نفوس کا قانون ہے۔ اس لحاظ سے سقراط نے صرف اخلاقیات ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ الٰہیات کو بھی اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ ''(۱۶)

سقراط نے انسان کے مقصد حیات پر غور کیا ہے اور خیر و شر کے فلسفے پر گفتگو کی دعوت دی ہے۔ اس نے علم اور حصول علم کے بارے میں سوال اٹھایا ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن کے بقول:

''سقراطی طریق کار کا بنیادی نقطہ اپنے مخاطب کو اس کی لاعلمی کا احساس دلانا تھا۔ اس کے نزدیک لاعلمی کا اعتراف حصولِ علم کی جانب پہلا قدم تھا کیوں کہ اپنے علمی زعم میں مبتلا شخص حصولِ علم پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتا۔ سقراط لوگوں سے سوال و جواب کر کے انہیں یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ محض جاہل بلکہ اجہل ہیں۔'' (۱۷)

سقراط کا قول ہے:

''میں دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں

میں جانتا ہوں

میں کچھ نہیں جانتا۔''(۱۸)

پال ژانے کے خیال میں سقراط نے فلسفے کو آسمان سے زمین پر اتارااور اسے شہروں اور گھروں میں داخل کیا۔اس نے فلسفے کا رخ کائنات سے سیاسی اور اخلاقی مسائل کی طرف موڑا لیکن وہ صرف علم اخلاق کا بانی نہیں کیوں کہ اس کا فکری طریقِ کار بیس صدیوں تک ذہن انسانی کی رہ نمائی کرتا رہا۔اس کے نزدیک

''علم کی غایت اس دائمی اصول کی دریافت ہے جو جزئی اور حادث اشیا کے تحت پایا جاتا ہے۔یہ دائمی عنصر کلی تعقل یا تصور ہے اور علم کی غایت اس کی تعریف کا کھوج لگانا۔'' (۱۹)

سقراط زندگی بھر دنیا کی رنگینیوں سے کنارہ گیر رہا۔شرک اور بت پرستی سے اسے شدید نفرت تھی۔اس نے کئی مرتبہ یونانی پادریوں سے بت پرستی پر مناظرہ کیا اور انہیں شکست دی۔اس وجہ سے انہوں نے عوام وخواص کو سقراط کے خلاف بھڑکا دیا اور بادشاہ وقت سے اس کے لیے سزائے موت طلب کی۔بعض کے نزدیک اس کی سزائے موت کا سبب یہ واقعہ بنا کہ ایک روز بادشاہ اس کے قریب سے گزرااور اسے بے نیاز پاکر اس سے یوں مخاطب ہوا:

''تم جانتے نہیں ہو کہ میں تمہارا آقا ہوں اور تم میرے غلام ہو۔'' سقراط نے جواب دیا: ''تم غفلت میں ہو، حرص اور شہوت میرے غلام ہیں اور تم ان کے غلام۔اس طرح تم میرے غلام در غلام ہو۔''اس جواب نے بادشاہ کو غضب ناک کر دیا۔سقراط کے موحد ہونے کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ایک وفعہ کسی نے سقراط سے پوچھا: کون سی چیز تخلیق کائنات کا سبب بنی۔اس نے جواب دیا:''اللہ کا جود وکرم'' (۲۰)

سقراط بقائے روح کا قائل تھااور روح کی عظمت کے بارے میں پختہ یقین رکھتا تھا۔اس کے نزدیک انسان کے لیے وجہِ شرف امارت،اقتدار یا شہرت نہیں بلکہ صفائے روح ہے۔وہ کہتا ہے کہ:

''انسان کے پاس روح سے بیش بہا کوئی چیز نہیں۔اس لیے انسان کا سب سے بڑا فرض روح کی نگہداشت ہے۔''(۲۱)

''اپالوجی'' وہ تقریر ہے جو اس نے اپنے سزائے موت کے مقدمہ کے دوران میں اپنے دفاع میں کی۔اس نے کہا:

''خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے اور دوسروں کے باطن کی تلاش کا فلسفیانہ مشن پورا کروں۔موت کا خوف دانائی نہیں کیوں کہ کوئی نہیں جانتا کہ شاید موت اس کے حق میں بر تر خیر ہو۔اگر اس شرط پر میری جان بخشی جائے کہ فلسفیانہ مشن کو ترک کر دوں تو میرا جواب یہ ہوگا کہ ایتھنز کے لوگو میں تمہارا احترام کرتا ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میں تمہاری بجائے خدا کی اطاعت کرتا ہوں۔جان لو یہ حکم خداوندی ہے۔'' (۲۲)

سقراط کے ان موحدانہ خیالات سے یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید وہ فرستادگانِ خدا میں سے تھا جو اپنے عہد کے بت پرست انسانی معاشرہ میں پیغمبرانہ شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا اور اعلانے کلمۃ الحق کی پاداش میں گردن زنی کی سزا کا مستحق ٹھہرا۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ''سرگذشتِ فلسفہ'' میں سقراط کے نبی ہونے کے خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یونان کے عروجِ ثقافت کے اس تاریک دور میں سقراط فکر ونبوت کی نورانی مشعل لے کر نمودار ہوا، جس کی امواجِ نور نے فکرِ یونانی کی اس خود فریبی کا دامن تار تار کر دیا اور لوگوں کو صحیح خطوط پر سوچنے، خیر وشر اور حسن وقبح میں امتیاز کرنے کے فطری معیار سے آگاہ کیا۔'' (۲۳)

افلاطون اور ارسطو کی بدولت فلسفۂ یونان دورِ عروج سے ہم کنار ہوتا ہے۔اس دور میں ان دو فلسفیوں نے گذشتہ علم کی ترتیب وتنظیم کی اور فلسفہ کو ایک جامع ومانع نظام بنا دیا۔

''افلاطون (۴۲۸ — ۳۴۷ق م) ابتدا میں شعر وشاعری کی طرف مائل تھا لیکن ایک روز سقراط سے یہ بات سنی کہ ''انسان کو حقائق کی تلاش کرنی چاہیے'' ۔یہ جملہ فلسفے میں اس کی دل چسپی کا باعث بن گیا۔اس نے شاعری ترک کر دی اور سقراط سے فیثا غورثی فلسفہ سیکھنے لگ پڑا۔جہاں سقراط نے کوئی کتاب نہیں لکھی وہاں افلاطون سقراط کے بر عکس کثیر التصانیف تھا۔اپنے طلبہ کو فلسفہ پڑھانے کے دوران میں ٹہلتا رہتا۔اس کے شاگرد بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے۔چناں چہ اس جماعت کا نام ''مشائیین'' پڑ گیا۔'' (۲۴)

حوالہ جات

۱۔ الفرڈ وبر، تاریخ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)،۱۹۳۸ء ص:۷۵

۲۔ایڈولف ہولم، تاریخ یونان قدیم، مترجم: محمد ہارون خان شیرانی ، نفیس اکیڈمی، اردو بازار کراچی، ۱۹۸۷ء، حصہ اول، ص:۱۵۹

۳۔ ہومر، جہاں گرد کی واپسی، مترجم محمد سلیم الرحمٰن، مکتبہ جدید لاہور، بار اول ۱۹۶۴ء

۴۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، علمی کتاب خانہ، اردو بازار لا: لاہور، ۲۰۰۹، ص:۴۵

۵۔ گمپرز Great Thinkers (یونانی اہل فکر) مترجم لاری میکنس بہ حوالہ: ریپوپارٹ، فلسفہ کی پہلی کتاب، مترجم: ڈاکٹر میر ولی الدین، محولہ بالا، ص:۵۲

۶۔ برٹرینڈ رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ مترجم: پروفیسر محمد بشیر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء ص:۳۰

۷۔ ریپوپارٹ، فلسفہ کی پہلی کتاب محولہ بالا ص:۵۳

۸۔ الفرڈ وبر، تاریخ فلسفہ، مترجم: ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)،۱۹۳۸ء ص:۷۵

۹۔ یاسر جواد فلسفیوں کا انسائیکلوپیڈیا، بک ہوم، مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۵، ص:۳۱ ، ۳۲

۱۰۔ قفطی، جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف، تاریخ الحکماء، مترجم: ڈاکٹر غلام جیلانی برق، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء ص:۳۵۱

۱۱۔ قیصر الاسلام، قاضی، فلسفے کے جدید نظریات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۸، ص:۵۱۹

۱۲۔ برٹرینڈ رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ ، محولہ بالا، ص:۶۵

۱۳۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، علمی کتاب خانہ، اردو بازار لا: لاہور، ۲۰۰۹، ص: ۶۶،۶۵

۱۴۔ الفرڈ ویبر، تاریخِ فلسفہ، محولہ بالا، ص:۵۱

۱۵۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان ، علمی کتاب خانہ، اردو بازار لا: لاہور، ۲۰۰۹، ص:۸۷

ایک رائے یہ بھی ہے کہ ''خود را بشناس'' طالیس ملطی کا مقولہ ہے جسے سقراط نے اختیار کیا۔

۱۶۔ الفرڈ ویبر، تاریخِ فلسفہ، محولہ بالا، ص:۵۴،۵۳

۱۷۔ محمد سلیم الرحمٰن، مشاہیرِ ادب، قوسین، سرکلر روڈ لاہور، ۱۹۹۲ ، ص:۳۱۲

۱۸۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، علمی کتاب خانہ، اردو بازار لا: لاہور، ۲۰۰۹، ص:۸۵

۱۹۔ پال ٹرانے/ گریل سیلے، تاریخ مسائل فلسفہ، مترجم: ڈاکٹر میر ولی الدین، سٹی بک پوائنٹ، اردو بازار کراچی، ۲۰۰۸ ص:۲۱

۲۰۔ قفطی، تاریخ الحکماء، محولہ بالا، ص:۲۸۳، ۲۸۴

۲۱۔ محمد سلیم الرحمٰن، مشاہیر ادب، محولہ بالا، ص:۳۱۳

۲۲۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، تاریخ فلسفہ یونان، علمی کتاب خانہ، اردو بازار لا: لاہور، ۲۰۰۹، ص: ۱۲۴، ۱۲۳

۲۳۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، سر گذشتِ فلسفہ، فیروز سنز لاہور، حصّہ دوم، اول، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۲

۲۴۔ قفطی، تاریخ الحکماء، محولہ بالا، ص:۴۰تا۴۶